کم سنی کی شادی ــــ بچوں سے زیادتی

نکاح دو ایسے افراد کے مابین سماجی معاہدہ کا نام ہے۔ جو عاقل و بالغ ہوں۔ اور برضا و رغبت ایکدوسرے کو قبول کریں۔ مگر ستم ظریفی دیکھیئے کہ ہمارے معاشرے میں یہ وہ سماجی معاہدہ ہے کہ جو دو غیر عاقل و بالغ افراد کے لیئے کوئی تیسرا فرد بھی انجام دے سکتا ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جن کے بارے میں یہ معاہدہ کیا گیا ہوتا ہے۔ بعض اوقات اپنی صغرسنی اور بے عقلی کی وجہ سے انہیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ انکی آئندہ کی زندگی کا فیصلہ انکے بزرگوں نے اپنے اختیار سے کر دیا ہے اور اب ان کے لیئے اس فیصلے پر آمنا و صدقنا کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

پاکستان کے دیہی علاقوں بالخصوص سندھ، پنجاب اور بلوچستان میں اس طرح کے نکاحوں کا رواج بہت زیادہ ہے۔ شاید اسی لیئے وہاں کے مرد، جب جوان اور سمجھدار ہو کر اپنی عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو اپنی پسند کی ایک شادی اور کرتے ہیں اور یوں پہلی بیوی کو عضو معطل بنا کر رکھ چھوڑتے ہیں جبکہ تلافی (Compensation) کے طور پر اپنی جائیداد غیر منقولہ میں بالعموم اسی کو شریک بنا دیتے ہیں۔ اس طرح اپنی دوسری بیوی کو، چاہتوں میں شریک کرتے ہیں لیکن عموماً اپنی جائیداد میں عضو معطل بنا دیتے ہیں۔ یوں دونوں بیویاں ہی مرد کے ظلم کا شکار ہوتی ہیں۔

اس ضمن میں اسلامی تعلیم یہ ہے کہ ایسے نکاحوں کو روکا جائے۔ کیونکہ عمر نکاح، بلوغ کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اور یہ بلوغ، جہاں جسمانی ہوتا ہے وہیں عقلی بھی ہوتا ہے۔ جب تک یہ دونوں بلوغ اکٹھے نہ ہو جائیں۔ اس وقت تک یہ رشتہ قائم نہیں ہونا چاہیے۔ (استثنائی صورتیں، اس عموم سے خارج ہیں)

قرآن کی رو سے نکاح کا تعلق بلوغ سے ہے۔

وابتلوا الیتامیٰ حتیٰ اذا بلغوا النکاح ۔ (النساء/۶)

اور یتیموں کی جانچ کرتے رہو، یہانتک کہ وہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جائیں۔

آیت میں بلوغ کی بجائے "نکاح" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ نکاح، بلوغ کو مستلزم ہے۔ لہٰذا کم عمری کی شادی، ازروئے قرآن صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک لڑکے کا سن بلوغ کامل طور پر اٹھارہ اور لڑکی کا سترہ سال ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک پندرہ سال ہے۔ ا؎ یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ شادی کے لیئے فقط جسمانی بلوغ ہی کافی نہیں ہوتا، عقلی بلوغ بھی لازم ہوتا ہے۔ جیسا کہ حتیٰ اذا بلغوا النکاح کے ساتھ آیا ہے۔

فان انستم منھم رشدا فادفعوا الیھم اموالھم ۔ (النساء/۶)

اور اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو ۲؎

اس فقرہ میں عمر نکاح کو رشد (عقلی بلوغ) کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے۔ ویسے تو یہ قرآنی حکم مال کی حوالگی یعنی قبضہ و تصرف کے سلسلہ میں وارد ہوا ہے۔ مگر اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جب مال کی اہمیت اسقدر ہے کہ وہ بغیر رشد کے "بالغوں" کے حوالے نہیں کیا جا سکتا تو کسی "جان" کو فقط جسمانی بلوغ کے ثبوت پر کیسے حوالے کیا جا سکتا ہے؟ کیا ہماری نگاہ میں کسی کا "وجود" مال سے بھی کمتر ہے کہ جسے حوالے کرنے کے لیئے کسی رشد (عقلی پختگی) کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی دوسرے یہ کہ جس طرح بعض صورتوں میں بلوغ کی علامات ظاہر نہیں ہو پاتیں مگر عمر ہو جاتی ہے تو اس صورت میں ہمارے پاس عقلی بلوغ (رشد) وہ واحد پیمانہ ہوتا ہے کہ جس سے حقیقی طور پر جواز نکاح کو ناپا جا سکتا ہے۔ اس لیئے بمقتضائے نص نکاح کے لیئے جسمانی صلاحیتوں کے ساتھ، عقلی صلاحیت بھی اس درجہ کی درکار ہونی چاہیئے جس درجہ کی حوالۂ مال میں ضروری سمجھی جاتی ہے۔

ازدواجی زندگی کے قیام و استحکام، مسرت و شادمانی اور ذہنی مطابقت و موافقت کا راز، دراصل ان دونوں صلاحیتوں کی یکساں موجودگی میں ہی ممکن ہے۔ اور ان میں سے کسی ایک بھی صلاحیت کا مفقود ہو جانا، شادی کی لازوال مسرتوں کو، حسرت و یاس اور زوال شادمانی میں تبدیل کر دینے کے مترادف ہے۔

والدین بالعموم یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کی جلد از جلد شادیاں کر دیں۔ اس فرض کو نبھانے میں وہ اسقدر عجلت اور مستعدی دکھاتے ہیں کہ بچوں کو بڑا بھی نہیں ہونے دیتے کہ کسی کے پلے باندھ دیتے ہیں یا کم از کم منسوب کر دیتے ہیں۔ اور اپنے تئیں یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنا فرض منصبی ادا کر دیا ہے۔ حالانکہ والدین کا اولین فرض یہ بنتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت کریں۔ ان کے اندر نیکی کا جوہر پیدا کریں اور ان کی صلاحیتوں کے مطابق انہیں معاش پیدا

کرنے کے قابل بنائیں تا کہ وہ اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو سکیں۔ جہاں تک شادی کا تعلق ہے یہ خود ان بچوں کا حق ہے، جسے استعمال کرنے کا موقع انہی کو ملنا چاہیے۔ البتہ اس سلسلے میں انکی رہنمائی ضرور کی جانی چاہیے۔ بچوں کو اس طرح تربیت دینے سے ان میں ذمہ دارانہ احساس پیدا ہوتا ہے۔ جو آگے چل کر ان کی ازدواجی زندگی کی بہتری اور ترقی کا سبب بنتا ہے۔

کم عمری میں شادی نہ ہونے کا اشارہ ہمیں اس آیت سے بھی ملتا ہے۔

فانکحوا ما طاب لکم من النساء۔ (النساء/۳)

پس تم ان عورتوں سے نکاح کرو، جو اچھی، عمدہ اور پاکیزہ ہوں۔

پہلی بات تو یہ کہ فانکحوا صیغہ امر ہے۔ یعنی حکم شرعی ہے۔ اور یہ حکم کسی غیر مکلف کو نہیں دیا جاسکتا۔ چنانچہ بچہ اپنی طفولیت کی باعث، اس حکم کا مخاطب نہیں۔ اس لیئے وہ نکاح بھی نہیں کرسکتا۔ دوسرے یہ کہ اس آیت میں "ماطاب لکم" بھی آیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو ان عورتوں سے نکاح کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جو عمدہ اور پاکیزہ ہوں اور صغرسنی میں بچہ، عورت کی عمدگی اور پاکیزگی کو نہیں جان سکتا۔ اس لیئے بھی چھوٹی عمر میں نکاح نہیں ہوسکتا۔ تیسرے یہ کہ آیت میں "النساء" کا لفظ موجود ہے۔ جسکا مطلوم "عورتیں ہیں نہ کہ بچیاں۔ چنانچہ النساء کا لفظ، خود انگلی رکھ کر بتا رہا ہے کہ شادی کے لیئے فریق ثانی کا "عورت" ہونا ضروری ہے۔ غرض کہ یہ آیت بھرپور طریقے سے کم سنی کی شادی کی ممانعت کا اعلان کررہی ہے۔

کم سنی کی شادی کے خلاف اس آیت میں بھی استدلال موجود ہے۔

یا ایھا الذین امنوا لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا۔ (النساء/۱۹)

اے ایمان والو تمہارے لیئے حلال نہیں ہے کہ عورتوں کے جبراً وارث بن جاؤ۔

جب بالغ عورتوں کے ساتھ زبردستی کرنے سے روکا گیا ہے تو نابالغ بچیوں سے نکاح کرنا، بدرجۂ اولیٰ جبرو اکراہ میں آئے گا۔ اس لیئے کہ کوئی نابالغ بچی اپنی پسند اور مرضی کے اظہار و بیان میں نااہل تصور کی جاتی ہے۔ اور بالفرض اگر وہ اظہار بھی کردے تو بھی اس کا اظہار، شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً غیر معتبر قرار پائے گا۔ کیونکہ اظہار اور چیز ہے اور فریق ثانی کی حیثیت سے معاہد بننا اور۔ نکاح صرف اظہار پسندیدگی کا نام نہیں ہے بلکہ عملاً ایک معاہدہ کا نام ہے۔

کم سنی میں شادی کے خلاف یہ آیت بھی ہمارا استدلال بنتی ہے۔

والمطلقت یتربصن بانفسھن ثلثۃ قروء۔ (البقرہ/۲۲۸)

اور مطلقہ عورتیں تین حیض تک انتظار کریں۔

اس آیت میں مطلقۂ مدخولہ کی عدت تین قروء (حیض یا پھر طہر) بتائی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نابالغ بچیوں سے نکاح صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ بصورت طلاق مع ادخال انکی عدت کا کوئی پیمانہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ عدم حیض کی وجہ سے ان پر حالت طہر کا بھی اطلاق نہیں ہوسکے گا کہ طہر کے لیئے حیض کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اور کم سنی میں اس صفت کا ہونا مفقود ہے۔

مناسب ہوگا کہ یہاں قروء کی قدرے وضاحت کردوں۔ قروء قرء کی جمع ہے۔ اور قرء دراصل حالت طہر سے حالت حیض میں داخل ہونے کا نام ہے بایں صورت یہ لفظ ذو معنیین ہے۔ اس لیئے دونوں حالتوں کا جامع ہے۔ اس لیئے بعض اوقات دونوں میں سے کسی ایک معنی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور یہ خصوصیت صرف اسی لفظ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وہ اسم جو دو معنوں کے لیئے وضع کیا گیا ہو وہ الگ الگ بھی ہر ایک کے لیئے بولا جاسکتا ہے۔ جیسے مائدہ کا لفظ، جو دسترخوان اور طعام دونوں کے لیئے وضع کیا گیا ہے مگر دونوں میں سے کسی ایک کے لیئے بھی بولا جاتا ہے۔ پس ثلثۃ قروء کا مطلب ہوگا۔ عورت کا تین دفعہ حالت طہر سے حالت حیض میں داخل ہونا۔ چنانچہ اس لفظ سے بھی پتہ چلا کہ حالت عموم کے تحت نابالغی کا نکاح ناقابل فہم ہے۔

صغرسنی کی شادی کی ممانعت پر اس آیت سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے۔

نساء کم حرث لکم فاتوا حرثکم انیٰ شئتم و قدموا لا نفسکم۔ (البقرہ/۲۲۳)

تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ پس جب چاہو تم اپنی کھیتیوں میں جاؤ۔ اور اپنے لیئے (کچھ) آگے بھیجو۔

اس آیت میں بیویوں کو شوہروں کی کھیتی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس تشبیہ میں عورتوں کے بلوغ کی موجودگی بہت واضح اور نمایاں نظر آتی ہے۔ کیونکہ صحبت باہمی (جو نکاح کو مستلزم ہے) کا مقصود حقیقی، نسل انسانی کو بڑھانا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نابالغ لڑکی اپنے کاشت کار کے لیئے کھیتی کا کردار ادا کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ اس لیئے نسل انسانی کو بڑھانے کا سبب بھی نہیں بن سکتی۔

آیت حیض میں بھی نابالغی کے نکاح کی ممانعت پر صاف دلیل موجود ہے۔

ویسئلونک عن المحیض قل ھو اذیً فاعتزلوا النساء فی المحیض ولا تقربوھن حتیٰ یطھرن ج فاذا تطھرن فاتوھن من حیث امرکم اللہ ط۔ (البقرہ/۲۲۲)

اور آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ بتا دیجئے کہ یہ ضرر رساں چیز ہے۔ پس حالت حیض میں بیویوں سے الگ رہو بلکہ (مقاربت کے لیئے) ان کے نزدیک بھی نہ جاؤ۔ یہاں تک کہ وہ پاک و صاف ہو لیں۔ پھر جب خوب اچھی طرح نہا لیں تو (بغرض صحبت) ان کے پاس جاؤ۔ جس طرح تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے۔

یہاں سوال کی نوعیت حالت حیض میں صحبت کرنے کی ظاہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ جواب سے معلوم ہو رہا ہے اس لیئے "ھو اذی" میں اشارہ صحبت کی طرف ہے نہ کہ حیض کی طرف۔ مطلب یہ کہ حیض میں بذات خود، کوئی ضرر نہیں، البتہ اس حالت میں صحبت کرنا دونوں کے لیئے ضرر رساں ہے۔ تبھی تو مقاربت سے روکا گیا ہے۔

حالت حیض میں بیویوں کے پاس جانے کی ممانعت کا حکم اس امر کو مستلزم ہے کہ وہ عورتیں مکمل طور پر بالغ ہو چکی ہیں۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ نابالغی میں عورت کا نکاح، اسلام کو مطلوب نہیں ہے۔

کم سنی کی شادی پر مجوزین نے قرآن کی ایک آیت سے استدلال کیا ہے۔ اس لیئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کو بھی سمجھ لیا جائے۔

والیٔ یئسن من المحیض من نسا کم ان ارتبتم فعدتھن ثلثۃ اشھر والیٔ لم یحضن۔

(الطلاق ۴)

اور جو تمہاری عورتیں (بوجہ زیادتی عمر) حیض سے مایوس ہو چکیں، اگر تمہیں شک ہو تو انکی عدت تین ماہ ہے۔ اور (ان کی عدت بھی تین ماہ ہے)۔ جنہیں (کسی مرض کے سبب) حیض نہیں آیا۔

بالعموم ہمارے مفسرین نے لم یحضن سے مراد ان لڑکیوں کو لیا ہے۔ جو نابالغ ہوتی ہیں۔ پھر اسی سے انہوں نے "نابالغی میں نکاح" کو ثابت کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ واضح ہو کہ عدت کا مسئلہ صحبت و مقاربت کے بعد متحقق ہوتا ہے۔ اس لیئے نابالغی میں تین ماہ کی عدت کا مطلب یہ ہوا کہ بچی کے ساتھ، نابالغی میں "صحبت" بھی کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ عدم صحبت پر کوئی عدت نہیں ہے۔

ایسے نکاح کو آپ تصور میں لایئے اور بتایئے کہ کیا یہ لڑکی کے ساتھ ظلم نہیں ہے کہ قدرت نے ابھی اسے اس مقصد کے لیئے تیار بھی نہیں کیا۔ اور ہم اسے اپنی جنسی خواہش کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ اسے "شریعت" بھی سمجھ رہے ہیں۔ کیا کسی ایسے بچے کو گوشت کھلایا جا سکتا ہے جو ابھی تک صرف دودھ پیتا ہو؟ کیا کسی ایسے بچے کو دوڑایا جا سکتا ہے، جس نے ابھی صحیح طور پر چلنا بھی نہ سیکھا ہو؟ کیا

کسی ایسی بچی کو صحبت کے لیئے استعمال کیا جا سکتا ہے جو جنسی معاملات اور دو طرفہ ملاپ کی خبر بھی نہ رکھتی ہو اور نہ فریق مخالف کو جھیلنے کی سکت اپنے اندر پاتی ہو۔ کیا ہمارے علماء یہ فقہی مسئلہ بھول گئے کہ جبر و بالقہ کے ساتھ بغیر مرضی و رضامندی کے صحبت نہیں ہو سکتی۔ پھر کس قدر ظلم ہے کہ ایک طرف تو یہ مسئلہ ہو اور دوسری طرف اس نابالغ بچی سے زبردستی صحبت کرنے پر اصرار ہو۔ جو ابھی تک ضرورت نکاح کی تفہیم سے ہی عاری ہو۔ پھر ایسی بچی بھلا اس فعل پر اپنی مرضی کیسے بتا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی بچی کے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا۔ وہ مکمل طور پر یکطرفہ اور بالجبر ہوگا۔ اسلامی معاشرہ کو چھوڑیئے ہم سمجھتے ہیں کہ کسی بھی انسانی معاشرہ میں ایسے جبر کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے خیال میں یہاں "لم یحضن" سے مراد جو "صغیرہ" کو لیا گیا ہے۔ دراصل یہ اسی کا شاخسانہ ہے۔ حالانکہ ہمارے مفسرین نے صغیرہ کے ساتھ ایک مفہوم اور بھی اخذ کیا ہے۔ اور ہمارے نزدیک وہ مفہوم درست بھی ہے۔ مگر افسوس کہ درست ہونے کے باوجود وہ مفہوم ان کے ہاں سند قبولیت حاصل نہ کر سکا۔ تاہم یہ بھی بسا غنیمت ہے کہ اسے ضمنی حیثیت کا درجہ تو مل گیا۔ اگر یہ بھی نہ ملتا تو ہم کیا کر سکتے تھے۔

اسی مؤخر الذکر مفہوم کی وجہ ترجیح و تقدیم میں ہمارے پاس وہ قرآنی دلائل ہیں۔ جن سے کم سنی کی شادی کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ (اور جو اوپر مذکور ہوئے) جبکہ مجوزین کے پاس، سوائے اس مقام کے، کوئی قرآنی دلیل نہیں ہے۔ اور ان کے حق میں اس دلیل کی جو کچھ بھی حقیقت اور حیثیت ہے۔ وہ آپ کے سامنے ہے۔

واضح رہے کہ جس طرح مرد کے بلوغ کا تعین، احتلام یا پھر سن سے ہوتا ہے۔ اسی طرح عورت کے بلوغ کا تعین، حیض یا پھر عمر سے ہوتا ہے۔ اس کا صاف اور صریح مطلب یہ ہوا کہ عورت کو حیض نہ آنا اس کے نابالغ ہونے کو مستلزم نہیں ہے۔ اسطرح کی عورتوں کو باعتبار حیض نہ سہی باعتبار عمر بالغ تصور کیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس آیت میں ایسی ہی بالغ عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ "بعض عورتیں، ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں تمام عمر حیض نہیں آتا۔"

ذیل میں ہم ان مفسرین کے اقوال درج کیئے دیتے ہیں۔ جنہوں نے لم یحضن کی تفسیر دونوں طرح سے کی ہوئی ہے۔

ا۔ مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی فرماتے ہیں۔

یعنی وہ صغیرہ ہوں یا عمر تو بلوغ کی آگئی مگر ابھی تک حیض نہ شروع ہوا ان کی عدت بھی تین ماہ ہے۔

۲۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ فرماتے ہیں۔

حیض خواہ کم سنی کی وجہ سے نہ آیا ہو یا اس وجہ سے کہ بعض عورتوں کو بہت دیر میں حیض آنا شروع ہوتا ہے اور شاذ و نادر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی عورت کو عمر بھر نہیں آتا۔[6]

۳۔ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ فرماتے ہیں۔

وہ عورتیں جو ابھی نابالغ ہوں یا جن کو حیض تو نہیں آیا لیکن وہ عمر کے اعتبار سے بالغ ہوگئی ہوں۔[7]

۴۔ مولانا صلاح الدین یوسف فرماتے ہیں۔

واضح رہے کہ نادر طور پر ایسا ہوتا ہے کہ عورت سن بلوغت کو پہنچ جاتی ہے اور اسے حیض نہیں آتا۔[8]

مذکورہ بالا چاروں مفسروں نے لم یحضن کی دوسری تفسیر، ان عورتوں سے کی ہے، جو جسمانی طور پر اتنی پختہ ہوگئی ہیں کہ انہیں بالغ ہی تصور کیا جاتا ہے تاہم کسی سبب سے انہیں حیض نہیں آپاتا۔ اس لیئے ایسی عورتیں اگر کسی کی منکوحہ بن جائیں تو ان پر ''صغیرہ'' کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ اور باعتبار عمر ایسی پختہ جسم کی بالغ لڑکیوں سے نکاح و صحبت دونوں جائز ہوں گے۔

اس مقام پر مولانا حافظ فرمان علی (اہل تشیع) کا حاشیہ قابل توجہ ہے۔ فرماتے ہیں:

''اس سے وہ عورتیں مراد نہیں، جو ابھی بالغ نہیں ہوئیں۔ کیونکہ ان کے لیئے عدہ نہیں بلکہ وہ عورتیں مقصود ہیں، جن کا سن حیض ہو چکا مگر کسی وجہ سے خون حیض نہ آیا۔ ان کا عدہ تین مہینے ہے۔''[9]

گویا اس مقام پر انہوں نے لم یحضن کی صرف ایک ہی تفسیر کی ہے۔ اور یہ وہی تفسیر ہے جو ہمارا اختیار بھی ہے۔ لم یحضن کی تفسیر میں مولانا عمر احمد عثمانیؒ نے بہت عمدہ اور علمی تجزیاتی بحث فرمائی ہے۔ میں چاہوں گا کہ یہ بحث انہی کے الفاظ میں نقل کردوں۔ ملاحظہ کیجئے۔

> ''واضح رہے کہ عربی زبان میں صرف سادہ نفی کے لیئے ''ما'' اور ''لا'' کے الفاظ آتے ہیں اور ''لم'' کا لفظ نفی جحد کے لیئے آتا ہے یعنی ایسی نفی کے لیئے جو انکار اور جحود پر مشتمل ہو۔ یعنی ''لم'' کے لیئے ضروری ہے کہ اس کے مقابلے میں واقعی طور پر یا اقتضائے حال کے طور پر مخالف ادعا پایا جاتا ہو۔ جس کا انکار مقصود ہو۔ ما حضن اور لم یحضن میں فرق ہی یہ ہے کہ ما حضن کے معنی ہیں کہ انہیں حیض نہیں آیا۔ جہاں کہیں حیض آنے کی نفی کرنی ہو وہاں آپ ما حضن کہہ سکتے ہیں لیکن لم یحضن اس وقت کہہ سکتے ہیں جب آپ کا مخاطب یہ دعویٰ کررہا ہو کہ حیض آچکا ہے لیکن آیا نہیں ہے اسے انکار و جحود کی نفی کہتے ہیں۔ ما حضن میں وہ شدت نہیں ہے۔ جو لم یحضن میں ہے۔ جو لڑکیاں بالغ ہو چکی ہیں وہاں اقتضائے حال کا یہ تقاضا بلکہ ادعا ہوتا ہے کہ انہیں ماہواری ایام ہوتے ہیں۔ اس ادعا کی تردید ما حضن کے لفظ سے نہیں ہوسکتی اسکے انکار و جحود کے لیئے لم یحضن کہنا ضروری ہوگا اسکے برعکس جو لڑکیاں کمسن اور نابالغ ہیں ان کے سلسلے میں نہ کوئی دعویٰ موجود ہے کہ انہیں ماہواری ایام آتے ہیں اور نہ ہی اقتضائے حال کا یہ تقاضا اور ادعا ہے۔ لہٰذا ان کے لیئے لم یحضن کہنا اصولی طور پر غلط اور وضاحت کے خلاف ہے۔ وہاں ما حضن ہی کہنا ہوگا۔ والی لم یحضن کو کمسن اور نابالغ لڑکیوں پر چسپاں کرنا اصول فصاحت کے لحاظ سے بھی غلط ہے۔[10]

روایات کی رو سے کمسنی کی شادی کے جواز پر ایک بڑی دلیل، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر سے بھی دی جاتی ہے۔ جو امام بخاریؒ کے مطابق چھ سال اور امام مسلمؒ کے مطابق سات سال کی عمر میں ہوئی۔ اور رخصتی نو سال کی عمر میں۔ اس سلسلہ میں کئی جوابات پیش کیئے جاسکتے ہیں۔

۱۔ ہمارے خیال میں یہ شادی آنحضرت ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ کیونکہ نکاح و طلاق میں آنحضرت ﷺ کے لیئے احکام جداگانہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہ امر بجائے خود کسی تفصیلی مضمون کا متقاضی ہے۔

۲۔ یہ شادی، نکاح کے سلسلہ میں قرآنی احکام نازل ہونے سے بہت پہلے واقع ہوئی۔ مطلب یہ کہ شادی مکہ میں ہوئی تھی اور نکاح کے سارے احکام مدینہ میں اترے، اس لیئے یہ نکاح الا ما قد سلف کے تحت درست قرار پاتا ہے۔

۳۔ بخاری و مسلم کی روایات پر تفصیلی جرح کے علمائے کرامؒ لکھے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں علامہ نیاز احمد کی کشف الغمہ عن عمر ام الامۃ (۲ جلدیں) علامہ حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلویؒ کی عمر عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور مولانا عمر احمد عثمانیؒ کی فقہ القرآن دیکھی جاسکتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے متعدد موقعوں پر ارشاد فرمایا ہے کہ باکرہ کا نکاح اسکی اجازت اور مرضی سے کیا جائے۔[11]

ظاہر ہے کہ نابالغی میں بچیوں کے نکاح اس ضمن میں نہیں آسکتے۔ پس ایسے نکاحوں سے فرمان رسول کی بھی مخالفت لازم آتی ہے جس سے احتراز لازم ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ عن الامام الاعظم ان اسن للغلام تمام ثمانی عشرۃ سنۃ وللجاریۃ تمام سبع عشرۃ سنۃ۔ سید محمود آلوسی بغدادی (متوفی ۱۲۷۰ھ) الجزء الرابع ص ۲۰۳، مکتبہ امدادیہ ملتان، سنہ اشاعت درج نہیں۔

۲۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آدمی کی عقل اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب وہ پچیس سال کا ہو جاتا ہے اور اطباء کا کہنا ہے کہ جو پچیس سال کا ہو گیا وہ اپنے عقل کی انتہا کو پہنچ گیا۔ یہاں انتہا سے مراد "رشد" کو لیا گیا ہے۔ (دیکھیے تفسیر روح المعانی، الجزء الرابع، ص ۲۰۹)

۳۔ امام راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ) المفردات فی غریب القرآن، کتاب الکاف، ص ۴۴۲، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی، سنہ اشاعت درج نہیں۔

۴۔ بعض النساء یعشق الی ان یستن ولا یحضن۔ (الجزء الثامن والعشرون، ص ۱۳۷)

۵۔ خزائن العرفان فی تفسیر القرآن، طابع و ناشر الحاج واحمد رضا اکیڈمی، کراچی (حاشیہ بر متعلقہ آیت، سورۃ طلاق، سنہ اشاعت درج نہیں۔

۶۔ تفہیم القرآن، جلد پنجم، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، طبع چہارم ۱۹۷۶ء، حاشیہ نمبر ۱۳، سورۃ الطلاق

۷۔ ضیاء القرآن، جلد پنجم، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور، ۱۴۰۰ھ، حاشیہ نمبر ۱۳، سورۃ الطلاق

۸۔ قرآن کریم مع اردو ترجمہ و تفسیر، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، سعودی عرب، حاشیہ زیر آیت، سورۃ الطلاق

۹۔ قرآن مجید مترجم، پیر محمد ابراہیم ٹرسٹ، کراچی نمبر ۵، سنہ اشاعت درج نہیں، حاشیہ بر آیت متعلقہ سورۃ الطلاق

۱۰۔ فقہ القرآن، خاندانی معاملات (نکاح وطلاق وغیرہ) ادارہ فکر اسلامی، کاشانہ حنیفہ، ۲۳۰، الیسر داس اسٹریٹ، نگار ان ایسٹ، کراچی نمبر ۳، طبع دوم ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۲۔ ۱۱۳

۱۱۔ والبکر تستاذن فی نفسہا واذنہا صماتہا۔ الصحیح المسلم، رقم الحدیث ۳۴۷۲۔ ۳۴۷۳

والبکر یستاذنہا ابوھا فی نفسہا واذنہا صماتہا۔ الصحیح المسلم، رقم الحدیث ۳۴۷۴

پسند کی شادی — ایک سماجی ضرورت

ہر عاقل و بالغ فرد کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنی پسند کی شادی کرے۔ انسان کے بنیادی حقوق میں یہ انتہائی اہم حق ہے۔ مگر افسوس کہ ہمارے معاشرے میں اس کا چلن پسندیدہ قرار نہیں دیا جاتا۔ بالخصوص خواتین اس ظلم کا شکار ہوتی ہیں۔ انہیں بعض خاندانی مجبوریوں اور رسم و رواج کے تحت اس ظلم کا شکار کیا جاتا ہے۔ اور اگر کبھی وہ اپنے اس حق کو استعمال کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہیں تو بطور

سزا پورے خاندان سے کاٹ دی جاتی ہیں۔ انہیں قتل کر دیا جاتا ہے۔ بعض حالات میں تو یہ بھی ہوتا ہے کہ خود ان کا باپ یا بھائی یا کوئی رشتہ دار ان کا تعاقب کرتا رہتا ہے اور اس طرح وہ اپنی تمام عمر، خوف اور بے کلی کے سائے میں بسر کرتی ہیں۔ پسند کی شادی چونکہ انسان کی حریت فکر وعمل کی نمائندہ ہوتی ہے۔ اس لیے جس معاشرہ میں لوگوں کو پسند کی شادی کی اجازت نہ ہو اسے آزاد اسلامی معاشرہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قرآن مجید نے مردوں کو پسند کی شادی کا حکم دیا ہے۔

فانکحوا ما طاب لکم من النساء۔ (النساء ۳)

پس ان عورتوں سے شادی کرو جو تمہیں اچھی لگیں۔

طاب کے معنی کسی چیز کے عمدہ اور پاکیزہ ہونے کے ہیں۔ (لسان العرب) اسی سے طیب بنا ہے۔ طیب وہ چیز ہے جس سے حواس اور نفس دونوں کو لذت حاصل ہو۔ ۱ اس لیے ما طاب لکم سے مراد وہ عورتیں ہوں گی جن کی عمدگی اور پاکیزگی کی طرف انسانی نفس اس طرح مائل ہو کہ ان سے حصول لذت کا طالب نظر آئے۔

ما طاب لکم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے لیے پسندیدگی شرط ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پسندیدگی کے لیے دیکھنا بھی لازمی ہے۔ اس لیے اسلامی شریعت کی رو سے شادی کے لیے عورت کو نہ صرف دیکھنے کی اجازت ہے بلکہ آپ نے ایک انصاری صحابی کو باقاعدہ دیکھنے کا حکم دیا تھا۔ ۲ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ! میں مدینہ منورہ کی ایک لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے پوچھا کیا تم نے اس لڑکی کو دیکھ لیا ہے۔ مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا جی نہیں یا رسول اللہ ﷺ! اس پر آپ ﷺ نے فرمایا۔ شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھ لو۔ کیونکہ یہ اس سے بہتر ہے کہ بعد میں پچھتاوا ہو۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کے ایک اور صحابی نے خود اپنا واقعہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا کہ اس نے ایک لڑکی کو علم ہوئے بغیر، چوری چھپے دیکھا اور پھر اسے شادی کی پیشکش کی۔ ۳

اسی لیے علمائے جمہور نے نکاح سے پہلے عورت کو دیکھنے کے جواز کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ دیکھنا عورت کی رضامندی سے ہونا چاہیے یا بغیر رضامندی کے۔ مگر اس اختلاف سے نفس مسئلہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس سے یہ مسئلہ ضرور مستنبط ہوتا ہے کہ اگر عورت کو اسکی رضامندی کے ساتھ دیکھا جائے گا تو یہ ناممکن ہے کہ مرد کا دیکھنا یک طرفہ ہو۔ یقیناً یہ دیکھنا دو طرفہ ہوگا۔ ہمارے خیال میں جس طرح مرد عورت کو دیکھ سکتا ہے اسی طرح عورت بھی مرد کو دیکھ سکتی ہے۔ مگر ہمارے اکثر مذہبی گھرانوں میں اس پر

عمل نہیں ہوتا۔ نکاح عموماً مرد یا عورت کو دیکھے بغیر ہو جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ، شادی کے بعد اکثر باہمی اختلافات کی صورت میں نظر آتا ہے۔

پسند کی شادی جس طرح مرد کا حق ہے وہیں مرد کی پسند پر قبولیت اور عدم قبولیت کا انحصار بہر حال عورتوں کی آزاد مرضی پر منحصر ہے۔

لا یحل لکم ان ترثو النساء کرھا ولا تعضلوھن لتذھبوا ببعض ما اتیتموھن الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ۔ (النساء:۱۹)

تمہارے لیئے جائز نہیں ہے کہ عورتوں پر زبردستی قبضہ کرلو۔ اور نہ انہیں جبراً اس غرض کے لیئے روک رکھو کہ جو کچھ تم نے انہیں دیا ہے اس میں سے کچھ واپس مل جائے۔ سوائے اس کے کہ وہ کسی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہوئی ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شادی میں مرد کی پسند کے ساتھ ساتھ عورت کی پسند کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں عورت کی پسند اور ناپسند کو در خور اعتناء نہیں سمجھا جاتا۔ صرف مردوں کی پسند کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

شوہروں کے انتخاب میں عورتوں کی پسند کی اہمیت کا اندازہ ان احادیث سے لگایا جاسکتا ہے۔ جن میں آپ ﷺ نے نکاح کو لڑکی کی اجازت پر موقوف کیا ہے۔

والبکر تستاذن فی نفسھا واذنھا صماتھا ۴

اور کنواری سے اسکے نکاح کے بارے میں اجازت لینی چاہیئے اور اسکی خاموشی کو اجازت پر محمول کرنا چاہیئے۔

اسی طرح آپ نے لڑکیوں کے باپوں کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ وہ باپ ہونے کا فائدہ نہ اٹھائیں بلکہ نکاح کے سلسلے میں اپنی بیٹیوں کی پسند کا پورا پورا لحاظ رکھیں۔

والبکر یستاذنھا ابوھا فی نفسھا واذنھا صماتھا ۵

اور کنواری سے بھی اس کا باپ اجازت لے۔ اگر وہ خاموش رہے تو اسے اجازت سمجھا جائے۔

حضرت خنساء بنت خزام انصاریؓ بیان کرتی ہیں کہ ان کے والد نے انکی مرضی کے خلاف کہیں اور نکاح کر دیا تھا۔ وہ شوہر دیدہ تھیں۔ اور انہیں یہ نکاح پسند نہ تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں تو آپ ﷺ نے وہ نکاح رد فرما دیا۔ ۶

حضرت ابو سلمہ بن عبدالرحمٰنؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے پاس ایک عورت نے آکر عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ! میرے دیور نے مجھے نکاح کا پیغام دیا تھا۔ جسے میرے باپ نے مسترد کر دیا ہے۔ اور میرا نکاح وہاں کر دیا ہے جہاں مجھے پسند نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے والد کو بلوایا اور اس سے صورتحال معلوم کی۔ عورت کے باپ نے کہا کہ میں نے اسکے نکاح میں کسی اچھائی کو ترک نہیں کیا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ نکاح نہیں ہوا۔ اور (عورت سے فرمایا) جاؤ، جس سے چاہو نکاح کر لو۔ ۷

اگر کوئی نکاح، لڑکی کی مرضی کے مطابق ہوا ہو۔ اور اس نکاح میں لڑکی کے باپ کا مشورہ شامل نہ ہو۔ تب بھی اس نکاح کو نکاح صحیح سمجھا جائے گا۔ اس مسئلہ کو درج ذیل روایت کی روشنی میں دیکھیے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی بیٹی (یعنی اپنی بھانجی) کا نکاح منذر بن الزبیر سے کر دیا۔ اس وقت عبدالرحمٰن موجود نہیں تھے۔ جب وہ آئے تو انہوں نے ناراض ہو کر کہا کہ اے خدا کے بندو! کیا مجھ جیسے شخص کی بیٹی کا نکاح اس کے مشورے کے بغیر کیا جاسکتا ہے؟ اس پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خفگی کے لہجے میں فرمایا کیا تمہیں منذر پسند نہیں؟ ۸

مذکورہ بالا روایت میں جس طرح لڑکی کی مرضی کا لحاظ کرتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے لڑکی کا نکاح فرمایا۔ اس طرح ایک ماں نے بھی اپنی بیٹی کا نکاح اسکے ولی کی اجازت کے بغیر کر دیا تھا جسے حضرت علیؓ نے درست قرار دیا۔ ذیل میں وہ روایت ملاحظہ کیجئے۔

عن علی انہ اجاز نکاح امراۃ بغیر ولی انکحتھا امھا برضاھا ۹

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک ایسی عورت کے نکاح کو جائز قرار دیا جس کا نکاح بغیر اذن ولی کے اسکی ماں نے اسکی مرضی سے کر دیا تھا۔

ان تمام روایات میں جو چیز مشترک ہے۔ وہ لڑکی کی پسند اور مرضی ہے جسے ہر حال میں اولیت دی گئی ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں یہ چیز اجنبی بن کر رہ گئی ہے۔ اس پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

نکاح میں "ایجاب وقبول" کے صیغے اس امر کی شہادت کے لیئے کافی ہیں کہ مرد و عورت دونوں اپنی اپنی پسند میں کاملاً خود مختار بنائے گئے ہیں۔ مگر ہمارے غیر اسلامی کلچر نے نکاح کی جو ہریت کو فنا کر کے رکھ دیا ہے۔ کتنی خواتین ایسی ہیں، جو بھیڑ بکریوں کی طرح، کسی بھی کھونٹے سے باندھ دی جاتی

ہیں۔ اور جو اس طرح نہیں بندھنا چاہتیں انہیں بے حیا، بدچلن اور آوارہ منش قرار دے دیا جاتا ہے۔

باب نکاح میں عورت کے انتخاب کا مسئلہ بھی اتنا ہی زیادہ اہم ہے جتنا مرد کے انتخاب کا۔ قرآن نے میاں بیوی کو ایکدوسرے کا لباس قرار دیا ہے۔ (البقرہ ۲:۱۸۷) لباس کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ جسم کے مطابق ہو، اور جو لباس بدن کے مطابق نہ ہو اسے نہیں پہنتے۔ تاکہ شخصیت غیر متوازن نہ ہو۔ ''ھن لباس لکم'' کا مطلب یہی ہے کہ عورتیں مردوں کا ذوق انتخاب ہیں۔ اور ''وانتم لباس لھن'' کا مطلب یہ ہے کہ مرد، عورتوں کا ذوق انتخاب ہیں۔ یوں مرد و عورت دونوں ایکدوسرے کے پسند فرمودہ ہوتے ہیں۔ چاہتوں کے انوٹ انگ بکر تمام زندگی محبتیں بکھیرتے رہتے ہیں۔ اور ایکدوسرے کے لیئے دلچسپی کا سامان بنے رہتے ہیں۔ ذہنی آسودگی کا یہ سفر دونوں کو تازیست خوش وخرم رکھتا ہے۔ میاں بیوی کی یہ محبتیں اور پسندیدگیاں ان کے بچوں میں منتقل ہوتی ہیں۔ ایسے جوڑوں کے بچے کسی نفسیاتی اور اخلاقی الجھنوں میں مبتلا نہیں ہوتے۔ وہ غربتوں میں بھی خوشحال نظر آتے ہیں۔ مقابلۃً ان جوڑوں کے، جو مارے باندھے کے زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ باوجود مالدار ہونے کے بیزار اور پریشان نظر آتے ہیں۔ باہمی نفرتوں اور عدم محبتوں میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ وقت سے پہلے بوڑھے اور مضمحل ہو جاتے ہیں۔ انکی عائلی زندگی کا زہر ان کے بچوں میں تلخیاں گھول دیتا ہے وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اخلاقی و نفسیاتی مفاسد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ اس طرح کے جوڑے، معاشرہ کو اچھی پروڈکشن دینے سے قاصر ہوتے ہیں اس لیئے دوطرفہ پسند کی شادی، صرف مرد و عورت کی ہی ضرورت نہیں بلکہ ہمارے سماج کی بھی ضرورت ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ امام راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، واصل الغیب ما تستلذہ الحواس وما تستلذہ النفس۔

۲۔ الصحیح المسلم، رقم الحدیث ۳۴۸۱، باب ندب من اراد نکاح امراۃ الیٰ ان ینظر الیٰ وجھھا و کفیھا قبل خطبتھا۔

۳۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، محمد رسول اللہ ﷺ، ترجمہ پروفیسر خالد عزیز، ص ۲۹۹، بیکن بکس، ملتانی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، اشاعت دوم ۲۰۰۰ء

۴۔ الصحیح المسلم، رقم الحدیث ۳۴۷۲، قدرے تغیر لفظی کے ساتھ ایک اور حدیث متصل ہے۔ (۳۴۷۳)

۵۔ ایضاً ۳۴۷۴

۶۔ الجامع الصحیح البخاری، جلد اول، ص ۸۷۸۔۷۷۷، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، ۱۳۸۱ھ

۷۔ امام ابو بکر بن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۵ھ) المصنف ج ۴، ۲، ص ۱۳۳۔۱۳۲، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی ۱۴۰۶ھ

۸۔ ایضاً ص ۱۳۲

۹۔ ایضاً ص ۱۳۳

جہیز ـــــ ایک معاشرتی بوجھ

جہیز سے مراد وہ سامان ہے جو شادی کے وقت لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے والوں کو دیا جاتا ہے۔ اس سامان کو شادی کا لازمہ تصور کیا جاتا ہے۔ جو یہ سامان نہ دے یا نہ دے سکتا ہو تو وہاں شادی کا تصور تک نہیں کیا جاتا۔ یہ سامان جہیز ایک طول طویل فہرست پر مشتمل ہوتا ہے، جو ضروریات اور تحسینیات سے بڑھ کر تعیشات تک جا پہنچتا ہے۔ کہیں کہیں تو یہ سامان بالکل فرمائشی نوعیت کا ہوتا ہے۔ جسے پورا کرنا لڑکی والوں کی ذمہ داری قرار دیا جاتا ہے اور جہاں یہ فرمائش نہیں ہوتا وہاں بھی بالعموم فرمائش جیسا ہوتا ہے۔ اور اس اہتمام کو لڑکے والوں کی خاموش فرمائش تصور کر لیا جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر غریب خاندان کی لڑکیاں اس لعنت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ اور متوسط گھرانے کی لڑکیاں سامان جہیز میں خوب سے خوب تر کی جستجو میں برباد ہو جاتی ہیں۔ جہیز کی طلب اور رسد نے ''نکاح'' جیسے ضروری، فطری اور پاکیزہ و حلال عمل کو پابہ زنجیر کر رکھا ہے۔ اسی لیئے جہیز کی پابندی نے بعض لڑکیوں کو شرم و حیا سے آزاد کر دیا ہے کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ ان میں غربت و افلاس کی وجہ سے ''منکوحہ'' بننے کی شرط مفقود ہو چکی ہے۔ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ چاہے جانے کی فطری اور منہ زور خواہش نیز جنسی عمل کی تحریک بالآخر انہیں بدقوارگی کی راہ پر ڈال دیتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس راہ کا مسافر تمام زندگی تاریکیوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی بھٹکاتا رہتا ہے۔

جہیز کے فرض، واجب یا سنت ہونے کا کوئی تصور ہماری شریعت میں موجود نہیں ہے۔ شادی کے وقت گھر والوں کی طرف سے بہ طیب خاطر، اگر کوئی تحفہ یا ہدیہ پیش کر دیا جائے تو وہ جہیز کے ضمن میں نہیں آتا۔ پھر یہ کہ تحفہ کی شرعی حیثیت اس لزوم کے ساتھ بھی بہرحال نہ تو فرض بنتی ہے نہ واجب اور نہ سنت۔ زیادہ سے زیادہ اسے مستحب کے زمرہ میں لیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی فعل

استحباب کو اپنے اوپر لازم کرلیا جائے تو وہ بدعت بن جاتا ہے۔ بدقسمتی سے آج ہمارا معاشرہ اسی بدعت میں مبتلا ہے۔ شریف بیٹیاں اپنے باپوں کی دہلیز پر زندہ درگور ہوگئی ہیں۔

واذ الموؤدۃ سئلت بای ذنب قتلت۔ (التکویر ۸۔۹)

اور جب زندہ درگور سے پوچھا جائے گا کہ کس جرم پر ماری گئی۔

ہمارے خیال میں جہیز وہ معاشرتی آلۂ قتل ہے، جس سے ہماری بیٹیوں کو قتل کیا جارہا ہے۔ معاشرہ کا اجتماعی ضمیر اس قتلِ عام کو روکنے میں اپنا موثر کردار ادا کرے۔

جہیز کا لفظ آج جس معنی میں بولا جاتا ہے عہدِ رسالت مآب ﷺ میں اس معنی کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ جہیز کے سنت ہونے کی غلط فہمی جس روایت سے اخذ ہوئی ہے۔ پہلے ہم وہ روایت درج کرتے ہیں اور بعد میں اس کی تفصیل کرتے ہیں۔

عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال جھز رسول اللہ ﷺ فاطمۃ فی خمیل وقربۃ ووسادۃ حشوھا اذخر۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فاطمہؓ کو نکاح کے لیے تیار کیا اور انہیں ایک چادر، ایک مشکیزہ اور ایک ایسے تکیے کے ساتھ جس میں گھاس بھری ہوئی تھی روانہ کیا۔

یہ روایت جس عنوان کے تحت آئی ہے۔ وہ یہ ہے جھاز الرجل ابنتہ اور اس کا ترجمہ یہ کردیا گیا ہے۔ اپنی بیٹی کو جہیز دینے کا بیان ہے۔ ظاہر ہے کہ جب جھاز کا ترجمہ جہیز سے کیا جائے گا تو پھر اسے سنت رسول ﷺ ماننے کی سبیل پیدا ہوجائے گی۔ اسی طرح روایت میں جھز کا ترجمہ بھی مذکورہ مترجمین نے "جہیز" کے لفظ سے کیا ہے۔ اور جہیز چونکہ ہمارے ہاں ایک خاص مفہوم میں بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اس غلط فہمی کا پیدا ہونا بھی قدرتی امر ہے۔ حالانکہ از روئے لغت، الجھاز، سفری سامان کو کہا جاتا ہے۔ سفری سامان چونکہ مسافر کی ضرورت ہوتا ہے۔ اس لیے آگے چل کر ہر اس سامان کو کہا جانے لگا جو کسی کی ضرورت ہو اور تجہیز کا لفظ سامان سفر کے اٹھانے یا بھیجنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس معنی کی تائید کے لیے آیت ملاحظہ ہو۔

ولما جھزھم بجھازھم۔ (یوسف ۵۹)

اور جب انہیں ان کے سامان سے تیار کردیا۔

اس معنی کی رو سے بوقت نکاح حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ کچھ ضروری سامان

کا بھیجنا ہمارے معاشرہ کے روزمرہ میں استعمال ہونے والے "جہیز" سے کسی طرح بھی لگا نہیں کھاتا۔ کیونکہ اسی مفہوم کی ایک روایت سنن ابن ماجہ میں جو آئی ہے، اس میں اس سامان کی نسبت صیغۂ مفرد کے بجائے صیغۂ تثنیہ میں کی گئی ہے۔ اور تثنیہ کے صیغے سے جو مفہوم بنتا ہے وہ علی اور فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں کو دینے کا بنتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ "جہیز" کی نسبت مرد کی طرف نہیں کی جاتی۔ روایت ملاحظہ ہو۔

ان رسول اللہ ﷺ الی علیا و فاطمۃ وھما فی خمیل لھما والخمیل القطیفۃ البیضاء من الصوف قد کان رسول اللہ ﷺ جھزھما بھا و سادۃ محشوۃ اذخرا و قربۃ۔ ۳

روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک دن علی اور فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس تشریف لائے اور وہ دونوں ایک چادر میں تھے۔ یہ وہ چادر تھی جو حضور ﷺ نے ان دونوں کو دی تھی اور یہ سفید اونی چادر تھی۔ نیز ایک تکیہ بھی دیا تھا جس میں گھاس بھری ہوئی تھی اور ایک مشکیزہ بھی دیا تھا۔

اس روایت میں "جہیز" کی نسبت دونوں کی طرف کی گئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں جھز اپنے لغوی معنی میں ہے نہ کہ اصطلاحی معنی میں۔

پھر اس جہیز کی حقیقت یہ ہے کہ وہ سامان، جو حضرت فاطمہؓ کے ساتھ کیا گیا تھا۔ وہ حضرت علیؓ کے اس مہر کی رقم سے خریدا گیا تھا جو حضرت فاطمہؓ کا مقرر ہوا تھا۔ ایک روایت کی رو سے آنحضرت ﷺ نے چونکہ حضرت علیؓ کی حطمی زرہ کو مہر قرار دے دیا تھا۔ ۳ اور اس سامان کے لیے اسی زرہ کو بیچا گیا تھا۔ اس لیے اس سامان کو ہم عرفی جہیز سے تعبیر نہیں کرسکتے۔

دراصل اس سامان کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ شادی کے بعد آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ اور فاطمہؓ کو ایک نئے مکان میں شفٹ کرنا تھا۔ جو انہیں ان کے ایک صحابی حضرت نعمان بن حارثہؓ نے اسی مقصد کے لیے گفٹ کیا تھا۔ چنانچہ نئے مکان میں شفٹ ہونے کے لیے ضروری اشیاء کا ہونا بھی ضروری تھا۔ اس سامان کی علت بس یہی تھی۔ اس لیے اسے کسی طرح بھی "جہیز" قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر یہ جہیز ہوتا تو آنحضرت ﷺ اس طرح کا سامان اپنی دوسری بیٹیوں کو بھی دیتے! آپ کی ازواج مطہرات بھی اپنے ساتھ ایسا کچھ سامان ضرور لاتیں۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی بیٹی کو جو کچھ دیا تھا وہ چونکہ علیؓ کے مہر کی رقم سے خرید کر دیا تھا۔ بایں صورت اسے "بری" کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مقابلۃً جہیز کے۔

ہمارے یہاں بری اس سامان کو کہا جاتا ہے جو لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی والوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں دلہن کے ملبوسات، زیورات، بناؤ سنگھار کا سامان اور خشک میوہ جات وغیرہ شامل

ہوتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس "بری" کولڑکی کا مہر بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ کوئی ہے جو سوچے اور سمجھے؟

حواشی وحوالہ جات

۱۔ سنن نسائی، جلد ۲۔ رقم الحدیث ۳۳۸۸

۲۔ سنن نسائی مترجم، دوست محمد شاکر۔ محمد عبدالستار قادری، جلد ۳، ص ۳۳۵۔ فرید بک اسٹال، اردو بازار لاہور، بار دوم ۲۰۰۲ء

۳۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد باب ضجاع آل محمد، جلد ۲، رقم الحدیث ۱۵۳۰۔ ص ۵۲۷، بار اول، ۱۹۸۳ء، فرید بک اسٹال، اردو بازار، لاہور۔

۴۔ امام یوسف زرقانی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۱۱۲۲ھ) مصابیح السیر المحمدیہ (فی شرح کتاب المواہب اللدنیہ) مطبوعہ ازھریہ مصر، ۱۳۲۵ھ میر خواند محمد بن خاوند بن محمود ہروی (متوفی ۹۰۳ھ)۔ روضۃ الصفائی سیرت الانبیاء والملوک والخلفاء۔ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ، ۱۸۹۱ء (بحوالہ لغۃ القرآن، حقوق نسواں اور باہمی تعلقات، مولانا عمر احمد عثمانی، طبع سوم، ۲۰۰۳ء، ص ۳۲۸۔ ۳۳۰۔ ادارہ فکر اسلامی، گارڈن ایسٹ، کراچی نمبر ۳۔)

مجلس التفسیر کی جانب سے
نوے سالہ اشاریہ معارف اعظم گڑھ
(صفحات ۹۳۲، ناشر: قرطاس، پوسٹ بکس نمبر ۸۴۵۳،
کراچی یونیورسٹی، کراچی۔ ۷۵۲۷۰)
کی اشاعت پر
محمد سہیل شفیق
استاد شعبہ اسلامی تاریخ،
رکن مجلس مساعدت، مجلس التفسیر
کو دلی مبارکباد

تعدد ازدواج کے قرآنی دلائل

ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج
استاذ الفقہ والتفسیر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

اسلام کی یہ خصوصیت مذاہب عالم میں اسے ممتاز کرتی ہے کہ اس نے مردوں کی لاتعداد شادیوں کے رواجی قانون کو چار کی حد تک محدود کر دیا ہے۔ جس زمانے میں یہ قانون مسلمانوں کو دیا گیا اس وقت متعدد لوگ ایسے موجود تھے جنکی بیویوں کی تعداد چار سے زیادہ تھی اور اس قانون (حکم) کے بعد انہیں اپنی باقیماندہ ازواج کو چھوڑنا پڑا۔ مثلاً حضرت نوفل بن معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لائے تو انکی پانچ بیویاں تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ ان میں سے کسی ایک کو طلاق دے دیں اور باقی چار کو رکھ لیں۔ (تفسیر کشاف) غیلان بن سلمہ ثقفیؓ ایمان لائے تو ان کی دس بیویاں تھیں اور وہ سب اسلام قبول کر چکی تھیں۔ انہیں بھی آنحضرت ﷺ نے یہی حکم دیا کہ کوئی چار رکھ لیں باقیوں کو طلاق دے دیں۔ (جامع ترمذی، رقم الحدیث: ۱۱۳۱، ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۱۹۵۳) عمیرۃ الاسدیؓ ایمان لائے تو انکی آٹھ بیویاں تھیں آنحضرت ﷺ نے انہیں فرمایا کہ ان میں سے کوئی چار رکھ لو باقی چھوڑ دو۔ حضرت قیس بن ثابتؓ بیان کرتے ہیں، جب میں مسلمان ہوا تو میری آٹھ بیویاں تھیں۔ میں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کو بیان کیا تو آپ نے فرمایا ان میں سے چار منتخب کر لو۔ (سنن ابن ماجہ: رقم الحدیث ۱۹۵۲، سنن ابوداؤد: رقم الحدیث: ۲۲۴۲)

بیک وقت متعدد ازواج کا رکھنا قرآن مجید کی جن آیات سے معلوم ہوتا ہے ان میں سب سے نمایاں آیت یہ ہے:

وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ و ثلٰث وربٰع

ج فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ۔ (النساء ۳)

اور اگر تمہیں یتیموں کے باب میں ناانصافی کا اندیشہ ہو تو ان (یتیموں کی) ماؤں سے نکاح کرلو۔ دو دو، تین تین، چار چار۔ اور اگر تمہیں ان کے مابین ناانصافی کا خوف ہو تو ایک ہی پر اکتفا کرو۔

گویا آیت جس تناظر میں اتری ہے وہ یتیموں اور بیواؤں کی آبادکاری اور کفالت و نگہداری کے مضمون پر مشتمل ہے۔ مگر اس خصوص میں حالت عموم کی نفی نہیں ہوتی جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے۔ اگر اس حکم کو اس کے تناظر میں مخصوص یا محدود کر دیا جائے تو قرآن کے دیگر احکام کو بھی اسی اصول کے پیش نظر اس کے مخصوص پس منظر میں محدود کرنا پڑے گا۔ اس طرح قرآن کے بیشتر احکام اپنے اپنے تناظر میں یعنی مخصوص حالات میں تو قابل عمل ٹھہریں گے اور عام حالات میں عمل سے خارج ہو جائیں گے۔ پھر یہ بھی سوچیے کہ اس طرح کرنے سے قرآن میں آخر بچے گا کیا؟ کہ جنہیں حالات عموی کے تحت روبہ عمل لایا جائے۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ آیت اصلاً تو بیواؤں سے نکاح کرنے کے سلسلے میں اتری ہے مگر غیر بیواؤں سے نکاح کرنا بھی اس کے ذیل میں آتا ہے۔

اس آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی کیا جاسکتا ہے:

اگر تم ڈرتے ہو کہ بالغ یتیم لڑکیوں کے ساتھ (کفالت کے پہلو سے) انصاف نہ کرسکو گے تو (انہیں) اپنی زوجیت میں لے آؤ۔

ظاہر ہے کہ اس ترجمے کی رو سے بھی ہم ایک حالت خصوص سے نکل کر دوسری حالت خصوص میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر نکاح ثانی پر جو پابندی بیواؤں کے تعلق سے بیان کی جاتی ہے۔ وہی پابندی اب یتیم لڑکیوں کے تعلق سے عائد ہوگی۔ بایں صورت یہاں بھی حالت عموم کا نفاذ نہیں ہو سکے گا۔

دوسری بات یہ کہ عموم و خصوص کی بحث اپنی جگہ، اس آیت سے نکاح ثانی بلکہ نکاح ثالث و رابع تک کے جواز کا استنباط، ہر معمولی عقل والا خود بھی کرسکتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ نکاح ثانی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ پہلی کو چھوڑ دیا جائے۔ پھر دوسری کی جائے جیسا کہ بعض دانشوروں کا خیال ہے۔ یہاں نکاح ثانی کا حکم ''تعدد ازدواج'' کی صورت میں ہی دیا گیا ہے۔ (تفصیل آگے آتی ہے)

تعدد ازدواج کی پہلی دلیل مثنیٰ وثلٰث وربٰع ہے۔ جسمیں دو دو، تین تین اور چار چار کی بات کی گئی ہے۔ ایک وقت میں ایک ہی بیوی کا اصول اگر مستقل اور دائمی اور ناقابل تغیر و تبدل ہوتا تو مثنیٰ وثلٰث

وربٰع کے الفاظ ہرگز استعمال نہ ہوتے۔

دو دو، تین تین اور چار چار کے الفاظ سے مراد یہ ہے کہ یہ تعداد نکاح کرنے والوں کے حالات کے مطابق ہونی چاہیے۔ اگر حالات کا تقاضا دو شادیوں کا ہو تو دو کرنی چاہئیں۔ اور اگر حالات تین کی اجازت دیں تو تین۔ علیٰ ھذا القیاس حالات کے مطابق بیک وقت چار تک شادیاں کی جاسکتی ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔

دوسری دلیل الا تعدلوا کے الفاظ میں موجود ہے جسمیں عدل کی شرط کا بیان ہے۔ ظاہر ہے کہ عدل کی شرط، بیک وقت متعدد بیویاں رکھنے کی صورت میں ہی عائد ہو سکتی ہے۔ عدل کی اس کڑی شرط نے ضرورت کی ناگزیریت کو تسلیم کرنے کے باوجود بہر حال دوسری شادی سے ایک قسم کی روک ضرور پیدا کر دی ہے۔

مذکورہ بالا آیت کے سیاق میں تعدد ازدواج کا ذکر جس ''ظاہری ضرورت'' کے تحت کیا گیا ہے وہ اصلاً یتیموں یا بیواؤں کی خبر گیری اور سرپرستی کی ضرورت کا پہلو ہے (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا) اگر کوئی اسی پہلو سے تعدد پر عمل کرنا چاہے تو ایسا نکاح خالصتاً ''منصوص'' ہوگا۔ مگر یہ اجتہادی اصول بھی سب کو تسلیم ہے کہ جو کام کسی ایک ضرورت کے تحت جائز ہو، وہ اس جیسی کسی دوسری ضرورت میں بھی جائز قرار پاتا ہے۔ اوپر ہم نے ''ظاہری ضرورت'' کے الفاظ لکھے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک چیز ہے ظاہری ضرورت اور دوسری ہے اصل ضرورت۔ ہمارے خیال میں عورتوں کی کثرت اور مردوں کی قلت کو ضرورت ظاہری کی ایک شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس لیے اس ضرورت کی حالت و کیفیت جہاں اور جس قدر پائی جائیگی۔ وہاں تعدد کی ضرورت بھی اسی کے مطابق ہوتی جائیگی۔ جیسا کہ روزنامہ جنگ کراچی میں ۱۵ جنوری ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں ایک خبر شائع ہوئی۔ جسکا متن یہ ہے:

> جمہوریہ چیچنیا کے قائم مقام وزیر اعظم رمضان قدیروف نے تجویز دی ہے کہ جنگ کے دوران بہت زیادہ تعداد میں مردوں کی ہلاکت کی وجہ سے ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت ہونی چاہیے۔ روسی ریڈیو پر گفتگو کرتے ہوئے روس نواز رہنما نے کہا کہ یہ چیچنیا کے لیے ضروری ہے کیونکہ ہم حالت جنگ میں ہیں اور ہمارے یہاں مردوں کی تعداد عورتوں کی نسبت کم ہے۔ انگی اس تجویز کی حمایت پارلیمنٹ کے ڈپٹی اسپیکر ولادیمیر ژرینووسکی نے بھی کی ہے۔ روسی قانون میں صرف ایک شادی کی اجازت ہے لیکن اسلامی قانون میں ایک مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے۔ رمضان

قدیروف نے کہا کہ عورتوں کی تعداد مردوں کی نسبت دس فیصد زیادہ ہے اور مردوں کو حکومت کی مداخلت کے بغیر اپنے لیئے عورتوں کا انتخاب کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ زیرینوسکی نے کہا کہ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت پورے روس میں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ ہمارے یہاں ایک کروڑ غیر شادی شدہ خواتین ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں قانون میں اس ترمیم کو متعارف کرائیں گے۔

علاوہ ازیں سماجی ضروریات بھی بعض اوقات، تعدد ازدواج کا تقاضا کرتی ہیں۔ فرض کیجیے کہ کسی شخص کی بیوی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جو بہت لمبے عرصے تک چلنے والی ہو اور جس میں شفایابی کی امید یا تو بالکل نہ ہو یا بہت کم ہو اور دوسری طرف اسکا شوہر تندرست وتوانا اور فطری طور پر جنسی آسودگی کا طلب گار ہو تو بتایئے کہ ان حالات میں وہ کیا کرے؟ واضح ہو کہ فقہاء کے مطابق نکاح ایک ایسا معاہدہ ہے جو عورت سے حصول تمتع کی خاطر مالک ہونے کے لیے کیا جاتا ہے۔(۱) ایسی صورت میں وہ شخص کیا اپنی بیوی کو طلاق دے دے یا کسی ناجائز طریقے سے اپنی جنسی خواہش پوری کرتا رہے یا پھر وہ دوسری شادی کرلے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عدل وانصاف اور انسانی ہمدردی کے پہلو سے موخر الذکر صورت ہی قابل عمل ہے۔

اسی طرح فرض کیجیے کہ کسی شخص کی بیوی بانجھ ہو، مستند ڈاکٹر اور میڈیکل رپورٹس کے مطابق وہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہو۔ دوسری طرف اس کا شوہر نہ صرف صحت مند بلکہ مالدار بھی ہو، اور فطری طور پر صاحب اولاد ہونے کا خواہشمند بھی۔ کیونکہ نکاح کا مقصد جائز اولاد پیدا کرنا بھی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آتا ہے۔

وقدموا لانفسکم (البقرہ/۲۲۳) اور اپنے لیئے (نسل کو) آگے بڑھاؤ۔

بتایئے کہ ایسا شخص کیا کرے؟ آیا اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ یا اپنی فطری خواہش کا گلا گھونٹ دے یا پھر پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرلے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہاں بھی موخر الذکر صورت ہی قابل عمل ٹھہرتی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مرد کی جنسی صلاحیت وقوت عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ طولانی ہوتی ہے۔ عورتیں مردوں کے مقابلے میں بہت جلد اپنی جنسی رغبت کھو بیٹھتی ہیں۔ اسکے علاوہ ایام ماہواری، نیز وضع حمل کے بعد تقریباً چالیس دنوں تک ان سے جنسی ملاپ بھی ممکن نہیں ہو پاتا۔ یہ عورتوں کے وہ مستقل مسائل ہیں کہ جنہیں کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ امر بھی بعض مخصوص صورتوں

میں مردوں کو دوسری شادی پر مجبور کردیتا ہے۔ کیونکہ بعض مردوں کی جنسی خواہش شدید ہوتی ہے۔ اتنی شدید کہ اگر اسے جائز طریقے سے پورا نہ کرنے دیا جائے تو وہ خواہش انہیں غیر شرعی اور غیر فطری راہوں پر بھی ڈال سکتی ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جن قوموں نے تعدد ازدواج کو برا سمجھا ہے۔ وہی قومیں اکثر و بیشتر زناکاری میں مبتلا ہوئی ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں: بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ماہرین حیاتیات کی شہادتیں اس تجربہ ومشاہدہ کی تائید میں ہیں کہ طبعی ضرورت سے قطع نظر مرد کی شہوانی جبلت تنوع پسند بھی ہے۔ اس لیئے جو شریعت اس کی اس جبلت کی کوئی رعایت اپنے نظام میں نہیں رکھتی۔ وہ اور کچھ بھی ہو، بہرحال خدائی اور مطابق فطرت نہیں کہی جاسکتی۔

بعض شادی شدہ مردوں میں عورتوں کے لیئے اتنی جاذبیت اور کشش موجود ہوتی ہے کہ وہ ان مردوں کی دوسری بیوی بننا (بغیر کسی دباؤ کے) بخوشی قبول کرلیتی ہیں۔ ایسے مردوں کے لیئے دوسری شادی کو کیسے روکا جاسکتا ہے؟

ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ "میں نے یورپ کی کئی فیشن زدہ مگر مذہبی خیالات وجذبات رکھنے والی عیسائی دوشیزاؤں سے پوچھا کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں آئیں اور وہ ایک سے زائد بیویوں کی موجودگی میں تم سے نکاح کرنا چاہیں تو کیا تم انکار کردوگی؟ ایک بھی کسی دوشیزہ نے اس سوال کے جواب میں نہیں کہنے کی جرأت نہیں کی۔"(۲)

ہمارے خیال میں دوسری شادی کی اجازت مرد کو شریعت وفطرت ہر دو نے بعض ضرورتوں کے پیش نظر دے رکھی ہے۔ اس لیئے اسے پہلی بیوی کی اجازت سے مشروط کرنا صاحب استحقاق مردوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ جسٹس (ریٹائرڈ) ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن نے اپنی کتاب مجموعہ قوانین اسلام جلد اول میں لکھا ہے کہ "پاکستان کے نافذ الوقت قانون میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسرے نکاح کی اجازت کے حصول کے لیئے موجودہ زوجہ کی مرضی غیر منطقی اور غیر حقیقی ہے۔ اس کو حذف کردینا چاہیئے۔ نیز دوسری شادی کے سلسلے میں ثالثی کونسل کا تقرر بھی غیر ضروری ہے، کیونکہ موجودہ بیوی کو فریق کی حیثیت حاصل نہیں، دراصل یہ معاملہ عائلی عدالت کے روبرو پیش کیا جانا چاہیئے۔ جو شرعی مصالح کے پیش نظر سرسری سماعت کے بعد اجازت دینے کی مجاز ہو۔(۳)

البتہ یہ امر لائق فہم اور قابل قبول لگتا ہے کہ مرد کی شادی کے وقت اسکی پہلی بیوی اگر یہ شرط لگادے کہ اس کا شوہر اسکی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کرسکتا تو ایسے مرد کو دوسری شادی کی اجازت

از روئے معاہدہ نہیں دی جاسکتی۔ تاوقتیکہ پہلی بیوی اپنی یہ شرط واپس نہ لے لے۔ اس حوالے سے خاندان عباسیہ کے خلیفہ المنصور کا قصہ تاریخ میں از حد مشہور و معروف ہے۔ خلیفہ المنصور نے اپنی بیوی کے ساتھ شادی کے وقت دوسری شادی نہ کرنے کی شرط کو منظور کر لیا تھا۔ چنانچہ اس دور کا کوئی مفتی اس شرط کو غیر قانونی یا غیر اسلامی قرار دینے کا فتویٰ نہ دے سکا۔(۴)

بیک وقت دو بیویوں کے رکھنے کا تصور اس آیت میں بھی موجود ہے۔

وان تجمعوا بین الاختین الا ما قد سلف ط (النساء ۲۳)

اور یہ کہ تم پر دو سگی بہنوں کا بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہوا۔ مگر یہ کہ جو پہلے گزر چکا (وہ معاف ہے) دو بہنیں (خواہ وہ حقیقی ہوں یا ماں شریک یا باپ شریک) ایک مرد کے نکاح میں ایک وقت میں حرام کر دی گئی ہیں۔ (اس پر قیاس کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کو بھی ایک ساتھ نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا ہے) اس قانون سے خود بخود واضح ہوتا ہے کہ دو عورتیں اگر آپس میں بہنیں نہ ہوں (یا پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی نہ ہوں) تو ایک ہی مرد کے نکاح میں جمع ہو سکتی ہیں۔ یہاں چونکہ یتیم بچوں اور بیواؤں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے تعدد ازدواج کی اپنی ضرورتوں کے قانون کا بھی پتہ چلتا ہے واضح ہو کہ یہ وہ ضرورتیں ہیں جو یتیم بالغ لڑکیوں اور بیواؤں کی بہبود سے بالکل ہٹ کر ہیں۔

اسی طرح اس آیت کو بھی دیکھئے۔

ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن او اباء ھن او اباء بعولتھن او ابناء ھن او ابناء بعولتھن۔

(النور ۳۱)

ان الفاظ میں عورتوں کو جن رشتوں کے سامنے زیب و زینت کے اظہار کی اجازت دی گئی ہے۔ وہ یہ ہیں۔ ۱۔ شوہر ۲۔ باپ ۳۔ شوہر کے والد ۴۔ اپنے بیٹے ۵۔ اور شوہر کے بیٹے اپنے بیٹے اور شوہر کے بیٹے میں حقیقی اور غیر حقیقی کا فرق بتایا گیا ہے۔ شوہر کے بیٹوں سے مراد، جہاں کسی مرحومہ یا مطلقہ کے بیٹے ہو سکتے ہیں۔ وہیں کسی موجودہ بیوی کے بیٹے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس امکان کو تسلیم کرنے کی صورت میں یہ آیت بھی تعدد ازدواج کے حق میں ہماری دلیل ہے۔ اور اس کلچر کی نمائندہ جو عربوں میں رائج تھا۔

وان اردتم استبدال زوج مکان زوج و اتیتم احدھن قنطارا فلا تاخذوا منه شیا۔ (النساء ۲۰)

اور اگر تم ایک بیوی کو چھوڑ کر اس کی جگہ دوسری بیوی کا ارادہ کرو تو جو کچھ تم نے ان میں سے کسی ایک کو ڈھیر سا مال دے دیا ہے تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔

ہمارے نزدیک یہ آیت بھی تعدد ازدواج کے حق میں ہماری دلیل ہے۔ آیت میں احدٰھن کا لفظ خصوصی توجہ کا متقاضی ہے۔ (احد مضاف ھن ضمیر جمع مؤنث غائب، مضاف الیہ) اس کا مطلب ہے ان عورتوں میں سے کسی ایک کو۔ معلوم رہے کہ احدٰھن کا معنی بعض اردو تراجم میں صحیح یا کامل طور پر ادا نہیں کیا گیا ہے۔ جسمیں تعدد ازدواج کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ تاہم تعدد کے مفہوم کو جن تراجم نے اپنے اندر سمویا ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

اور اگر تم چاہو بدل لینا، ایک جورو کا، ایک جورو کی جگہ (یعنی ایک کو طلاق دے کر دوسری سے نکاح کرنا) اور تم نے ان میں سے ایک کو بہت سا مال دیا ہو تو مت لو اس میں سے کچھ۔ (سر سید احمد خان)

ترجمہ میں درج ذیل الفاظ، تعدد ازدواج کے مفہوم کو ادا کر رہے ہیں۔

''ان میں سے ایک کو''

اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی ہی کرنا چاہو اور ان میں سے کسی کو تم نے خزانہ کا خزانہ دے رکھا ہو تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو۔ (مولانا محمد جونا گڑھی)

ترجمہ میں درج ذیل الفاظ قابل توجہ ہیں۔

''ان میں سے کسی کو''

اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم اس ایک کو جس کو چھوڑنا چاہتے ہو، ڈھیر مال دے چکے ہو تو تم اس مال میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔ (احمد سعید دہلوی)

تعدد ازدواج کے مفہوم کی ادائیگی کے لیے یہ الفاظ دیکھیے۔

اس ایک کو جس کو چھوڑنا چاہتے ہو۔

اس مفہوم کی تائید میں درج ذیل مترجمین مثلاً مولانا محمود حسین، سید محمد محدث کچھوچھوی، مولانا فرمان علی (اہل تشیع) مفتی احمد یار خان نعیمی، مولانا احمد سعید کاظمی، اور مولانا غلام رسول سعیدی کے تراجم بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

بہر حال آیت کو بحیثیت مجموعی دیکھنے سے تعدد ازدواج میں چار کی تحدید کا مفہوم اخذ ہوتا ہے